خواب کا ورثہ
حاجرہ عمران خان

خواب کا ورثہ

ہاجرہ عمران خان

میں ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا اسٹیٹس یہ ہے کہ میں ایک استاد ہوں اور ساتھ ہی ایک سیاسی ورکر بھی ہوں۔ ایک ایسا سیاسی ورکر جو ہر اس جماعت اور فرد سے اپنی امیدیں باندھ لیتا ہے جو اسے خوشحالی اور ترقی کے خواب دکھاتا ہے۔ جو پاکستانی عوام کی تقدیر بدل دینے کے بلند و بانگ دعوے کرتا ہے۔

کئی سال پہلے جب بی بی فاطمہ جناح رحمۃ اللہ علیہ نے ایوب خان کے خلاف صدارتی الیکشن لڑا میں اس وقت بھی ایک سیاسی ورکر تھا۔۔۔ اس حیثیت سے میں بی بی کے ساتھ کھڑا تھا۔ اگرچہ میری عمر آٹھ سال تھی اور میں اپنے باپ کا ہاتھ تھام کر فاطمہ جناح کے جلسے میں شریک ہونے جایا کرتا تھا۔ میرا باپ بھی ایک سیاسی ورکر تھا اور وہ تو پاکستان بننے سے پہلے ہی سیاست میں شامل ہو چکا تھا۔ 1938 میں جب خطبہ الہ آباد میں علامہ اقبال نے ایک اسلامی فلاحی خواب آگیں ریاست کا نظریہ پیش کیا تو وہ سولہ سال کا نوجوان تھا۔ اس خواب کے سارے رنگ اپنی امیدوں سمیت اس کی آنکھوں میں اتر گئے۔۔۔ جسطرح ایک بچے کے پیدا ہونے سے پہلے اس کی محبت اپنے پدر کے سینے میں ہلکورے لینے لگتی ہے۔۔۔ اس خواب نے میرے باپ کی آنکھوں، دل و روح میں پرورش پائی۔۔۔۔ وہ ہر اس جلسے اور کارنر میٹنگ کا حصہ بنا جہاں جہاں پاکستان کے مقدس وجود کی بات ہوتی۔۔۔ وہ پاکستان بننے سے پہلے اس کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا۔۔۔ اس کے لیے پاکستان ایسی محبوبہ کا نام تھا۔ جسے پانا اور ایک بار چھو لینے کی خواہش اس کی زندگی کی اول و آخر خواہش بن چکی تھی۔۔۔ وہ امید کی ڈور جو علامّہ اقبال کے خطاب سے اس کے دل نے مضبوطی سے پکڑ لی تھی، قائداعظم کے جلسوں خاص کر کے 23 مارچ 1940 کے جلسے میں شرکت کے بعد اس کے دل نے اور بھی مضبوطی سے تھام لی۔ کیونکہ اس جلسے میں صرف قرار دادِ پاکستان ہی منظور نہیں ہوئی بلکہ حیات علی کی آنکھوں میں بسنے والے خوابوں کی تعبیر کے وعدے بھی منظور کیے گئے۔ وہ امیدوں کے دیے روشن کرتا رہا اور ان کے سرے تھام کر صبح و شام امید کا سفر طے کرتا رہا ۔۔۔ بلآخر اس نے منزل مراد حاصل کر لی۔۔۔

رمضان کی ستائیسویں شب اس کا دل بامراد کر دیا گیا۔۔۔ اس جگہ جہاں بابِ پاکستان ہے وہاں کیمپوں میں وہ زخم ماندہ، آس و نراش میں گھرے کٹے پھٹے جسموں پر پھاہے لگاتا رہا ان کے زخم مندمل کرتا رہا۔ چھپ چھپ کر آنسوؤں کے نظرانے دھرتی ماں کے شوریدہ بدن کی نظر کرتا رہا۔ وہیں اس کو میری ماں ملی۔۔۔ جس کا جسم ہی کٹا پھٹا نہیں تھا بلکہ اس کی روح بھی چھید و چھید

تھی، یہ بڑے بڑے شگاف اس کی روح سے جھانکتے تھے جب وہ چلا کر کہتی۔۔۔۔۔"چھوڑ دو چھوڑ دو مجھے" تو ایسے تڑپتی جیسے کوئی اس کے وجود کو زخم وزخمی کر رہا ہو۔۔۔اسے چھیل رہا ہو، اس کی روح میں شگاف بنا رہا ہو۔۔۔پھر بیٹھے بیٹھے اچانک وہ نعرے لگانے لگتی

"لیکر رہیں گے پاکستان بن کے رہے گا پاکستان"

اس کے اگلے پچھلے وارث یا تو شہادت کے درجوں پر فائز ہو چکے تھے یا پھر بچھڑ گئے تھے۔کسی کا کچھ پتا نہ چل سکا۔وہ نیم پاگل حالت میں تھی۔میرے باپ حیات علی نے اس کے آگے پیچھے بہت پتا کرنے کی کوشش کی مگر کسی قسم کا سراغ نہ لگا سکا۔تب اسی نیم پاگل حالت میں اس نے میری ماں سے شادی کر لی۔۔۔۔۔وہیں کیمپ میں نکاح خواں کو بلایا گیا۔کچھ مہاجرین نکاح میں لڑکی والے بن گئے اور کچھ لوگ حیات علی میرے والد کی طرف سے باراتی۔یوں میری ماں میرے باپ کے گھر آگئی اور زندگی میں بھی شامل ہو گئی۔۔۔۔یہ ملن، خواب سے تعبیر تک کا حاصل تھا یا شاید ایک پڑاؤ۔

حیات علی کشور میری ماں کی بربادی کا ذمہ دار اپنے خواب کو قرار دیتا رہا۔۔۔اسے ہی اب اس نیم مردہ عورت کو آسرا دینا تھا اس کی روح کے شگافوں کو اعتماد اور محبت کے پھاہوں سے بھرنا تھا۔۔۔میرا باپ یقیناً ایک بہادر انسان تھا، وہ عورت اس کے لیے صرف عورت نہیں بلکہ ایک خواب کی کٹی پھٹی تعبیر تھی۔اسے اس کی روح کے زخموں کو بھی سینا تھا جن کی ٹیس وہ خود اپنے سینے میں محسوس کرتا تھا۔۔۔۔اس میں اس کو بہت وقت لگا۔اس دوران میں بھی اس دنیا میں آگیا۔میرے باپ کی آنکھوں کے سارے خواب مجھے وراثت میں ملے۔انھیں میں نے کبھی نہیں دیکھا مگر وہ خود بہ خود میرے روح و دل تک منتقل ہوئے۔۔۔میری ماں کے سارے دکھ بھی خود بہ خود میرے وجود میں منتقل ہو گئے جو آج تک میرے بدن میں پنپ رہے ہیں۔میرے ماں باپ کے دکھ سکھ خواب، امیدیں کھاد بن کر میرے وجود کی زمین کو زرخیز کرتے رہے اور اس ادھورے خواب کی آبیاری کرتے رہے جسے دنیا پاکستان کے نام سے جانتی ہے۔۔۔۔جس وقت قائداعظم نے پاکستان بننے کے بعد پہلے اجتماع سے خطاب کیا میرا باپ مجھے گود میں اٹھائے اس جلسے میں شامل ہوا۔۔۔۔نہ جانے کون سی امیدیں میرے دامن سے باندھنا چاہتا تھا۔۔۔

قائداعظم کی وفات ایک سانحہ بن کر وقوع ہوئی۔۔۔جسے ہر دل نے روتے روتے سینے سے لگایا۔۔۔ہر آنکھ اشک بار تھی ۔۔۔کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ سینہ آئندہ ستر سالوں میں کتنا زخم زخم ہو جائے گا۔میں حیران پریشان بھیگے چہروں کو دیکھتا رہا ۔۔۔۔یہ اشک بار چہرے آج بھی میری یادداشت کے خدوخال پر اسی طرح ایستادہ ہیں۔

فاطمہ جناح کو جب ایوب خان سے شکست ہوئی تو ایک اور المیہ تاریخ پاکستان کے سینے پر کندہ ہوا۔۔۔یہ ایک ایسا سانحہ تھا

کہ جس نے ایک بار پھر حب الوطن چہروں کو کملا کر رکھ دیا۔ اس وقت میں ایک متحرک سیاسی ورکر تھا۔ میرے لیے فاطمہ جناح کی شکست ایک دھچکے سے کم نہیں تھی۔ کئی دن بے چینی اور شکستگی میں گزرے مگر تب دشمن نے پاکستان کی سرحدوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی جس چھوٹے سے کانپتے پودے کو انہوں نے لہولہان حالت میں کسی مصلحت کے تحت سانس لینے کے لیے چھوڑ دیا تھا، اس امید پر کہ یہ خود ہی سوکھ کر کانٹا ہو جائے گا، وہ محض ان کی غلط فہمی کا شاخسانہ ثابت ہوا۔ ایک ایسا بچہ جو نحیف و نزار ہو اور جسے دنیا کے میدان میں گرم و سرد سہنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا گیا ہو وہ ابھی پوری طرح سنبھلا بھی نہ تھا کہ اس پر دشمن اپنی پوری طاقت سے حملہ آور ہو گیا گویا اس نحیف پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ایوب خان کے کلمہ ءتوحید نے قوم میں نئی روح پھونک دی۔۔ جس کلمہ ءحق لا الہ الا اللہ کی گردش میں وطن کو وجود کا لبادہ حاصل ہوا اسی کلمہ کی روشنی سینوں میں ایمانِ نو تازہ کر گئی اور اسی کلمہ کی چھاؤں میں ربِّ لم یزل نے نصرت و فتح یابی نصیب فرمائی۔

ایک بار پھر ایک سیاسی ورکر کی حیثیت سے سیاسی میدان میں اترا۔ روٹی کپڑا اور مکان جیسے عوامی نعروں کی بازگشت کو میں کیا اہمیت دیتا میری منشا اور منزل مراد ایک باشعور پڑھا لکھا پاکستان تھا اسی لیے میں شاید شعبہ ءتدریس سے وابستہ تھا۔

دل میں ڈھارس لیے اور امیدوں کی نئی کرنیں سنبھالتے سنبھالتے میں نے اکہتر کی جنگ بھی دیکھی۔۔۔ اقتدار کے ایوانوں میں طاقت کے نشے میں چُور بتانِ سیاست کا خونی کھیل بھی دیکھا اس وطن کے سینے میں اپنے عناد اور سیلفنس کا خنجر اتار کر اسے دولخت کر دینے والے ہاتھوں کو بھی دیکھا۔ میں اپنی امیدوں کو ہارتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

مجھے پاکستان کی محبت ورثے میں ملی تھی۔ میرے ماں باپ بوڑھے ہو چکے تھے مگر میرے جذبے ابھی جوان تھے شاید انہیں ہجرت اور خواب کا آبِ حیات پلایا گیا تھا۔ میرے باقی بہن بھائی ایک نارمل زندگی گزار رہے تھے۔ وہ اونچے حکومتی عہدوں پر فائز ہو کر اس ملک کی بیوروکریسی کا حصہ بن چکے تھے مگر میں ابھی تک خواب کا ورثہ سنبھالے بیٹھا تھا۔ میرے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ میری بیوی کا ان مقاصد و عوامل سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔۔ اس کا کنسرن اپنے گھر کا نظامِ حیات تھا۔۔۔ میرے باپ نے میرا نام محمد علی رکھا تھا۔۔۔ نہ جانے پاکستان میں بسنے والے دوسرے لوگ اس طرح کیوں نہیں سوچتے تھے؟ جیسے میں سوچتا تھا۔ میرا باپ اس سسٹم سے ہار مان بیٹھا تھا۔۔ میں اپنے ہی گھر میں اپنے بیوی بچوں کے درمیان اجنبی بن چکا تھا۔ سب مجھے عجیب سمجھتے تھے۔۔۔ کبھی کبھار میرا دل چاہتا کہ میں ایک عورت ہوتا تب میں اپنے بچوں کو ایک اچھا پاکستانی بنا سکتا۔۔۔ ہندی فلمی ثقافت کی اس یلغار سے اپنے بچوں کو بچا سکتا جس کا وہ شکار ہو چکے تھے۔ میرے سامنے تو وہ پی ٹی وی دیکھتے مگر جیسے ہی میں گھر سے باہر جاتا۔۔۔ ڈی ڈی ون گھر آ جاتا۔۔۔ میری بیوی کو ہندی فلمیں اور گانوں کا شوق تھا۔ اس شوق کا شکار میری نسل بھی ہو رہی تھی۔

میں ،میری امیدیں ان کی آبیاری یہی میری زندگی کا اولین مقصد بن کر رہ گیا ہے۔میں اپنے خوابوں کو شکست خوردہ نہیں دیکھ سکتا۔۔۔اسی لیے جہاں امید اگتی ہے میں اپنے بدن کا پسینہ لیکر پہنچ جاتا ہوں اس کی آبیاری کے لیے۔۔۔مگر یہ سیاستدان یہ ہر گز نہیں سدھرنے کے۔۔۔یہ اسی طرح جھوٹ بولتے رہیں گے۔۔۔۔میں ان کے جلسوں میں اپنے سوہنے پاکستان کی مکمل تعبیر ڈھونڈنے جاتا ہوں۔۔۔مگر خالی ہاتھ لوٹ آتا ہوں مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ میں ہمت ہار گیا ہوں۔۔۔میں نے کہیں پڑھا ہے کہ انسان کو اس کے خواب اونچا بناتے ہیں چاہے وہ پورے ہوں یا نہ ہوں۔۔۔

وہ جو سرحدوں پر اللہ کے بندے محافظ بن کر ڈٹے ہوئے ہیں کہ اپنے سے تین گناہ بڑے دشمن کو ایک انچ بھی آگے سرکنے نہیں دیتے وہی میری امید کے دیوں کو بجھنے نہیں دیتے۔

جب تک اس وطن کے سپائی کسی ریڑھی والے کی صورت ،کبھی کسی سٹوڈنٹ کے بھید میں اور کبھی کسی فقیر کے روپ میں اس وطن کے چوک چوراہوں کی حفاظت پر سرگرداں ہیں۔تب تک میں امیدوں کے دیے روشن کرتا رہوں گا۔

اس ملک کے لیے جان قربان کرنے والوں کا ابھی کال نہیں پڑا۔۔۔کچھ لوگ ہیں جو ابھی بھی پروانہ وار اس کی عظمت اور ردا پر اپنی جانیں لٹارہے ہیں۔یہ ملک شہداء کی جانوں کے نذرانے پر اپنی بقا کی عمارت تعمیر کیے کھڑا ہے۔جو اس کے وجود کی ضمانت بھی ہے۔

جب سنتا ہوں کہ بھارت میں کسی کو گائے ہلال کرنے کے شک میں جان سے مار دیا گیا ہے تو شکر ادا کرتا ہوں کہ پاکستان بن چکا ہے یہاں آزادانہ ہر سال عیدِ قرباں پر سینکڑوں گائیں قربان کی جاتی ہیں۔میں اور میرے ہم وطن پوری آزادی سے اپنے مذہبی فریضے کی ادائیگی کرتے ہیں اور ربِّ کریم کا شکر بجالاتے ہیں جس نے پاکستان دیا۔

جب وہ میری آئی ایس آئی اور دیگر خفیہ ایجنسیوں سے خوفزدہ ہوتے ہیں تو بھی شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ ہم سے ڈرتے ہیں ۔۔اپنے بچوں کو آزاد وطن میں سانس لیتے دیکھتا ہوں تو شکر ادا کرتا ہوں۔

اس ملک میں غربت ،بیروزگاری،ناانصافی ہے،کرپٹ سیاستدان ہیں اور سینکڑوں برائیاں ہیں مگر آزادی ہے۔۔۔جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہر برائی پر قابو پایا جاسکتا ہے اس کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا جاسکتا ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں جب معصوم بچوں کی پیلٹ گنوں سے آنکھیں شہید ہوتے دیکھتا ہوں تو بے اختیار اپنے بچوں کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہوں۔میں ایک باپ ہونے کی حیثیت سے اس درد کو اپنے سینے میں محسوس کر سکتا ہوں۔

دو سال کی عمر میں اپنے باپ کی گود میں سوار جلسوں میں جانے والا ایک عام پاکستانی ایک عام سیاسی ورکر ہوں۔میری امیدیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔میں سیاسی مکروہ اور بد نما چہروں کی اصلیت سے بھی واقف ہوں اس کے باوجود میں اپنی امید کو مرنے نہیں دے سکتا کیونکہ یہ وراثتی ہے۔جراثیم کی صورت میری رگ رگ میں پھیلی ہوئی ہے۔میرے اندر فصل کی طرح اگی ہوئی ہے۔

ایک خواب کی صورت اسے صرف منتقل ہونا ہے۔ورنہ یہ خواب میرے مرنے کے بعد بھی یہاں وہاں ہر طرف بھٹکتا رہے گا۔

میری بیٹی میرے سامنے بیٹھی ہے۔۔۔میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے۔۔۔اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔۔۔میرے سر پر بندھی خون آلود پٹی کو دیکھتی ہے اور روتی چلی جاتی ہے۔اسلام آباد کے پریڈ گراؤنڈ میں انصاف کی بھیک مانگنے پر میرا یہ حشر کیا گیا۔میں اس ملک کی خاطر انصاف مانگنے ہر جلسے جلوس میں جاتا ہوں۔۔۔میرے باپ کا قرض اتارنے جو وہ مرتے ہوئے میرے کاندھوں پر ڈال کر چلا گیا۔۔اپنی ماں کے لٹے پٹے وجود کا حساب مانگنے۔۔۔پولیس نے میرے ساتھ ساتھ سینکڑوں ورکروں کو اٹھالیا اور لاکر میں بند کر دیا۔۔۔رات انہوں نے ہمارے وجود کو اپنی ظلمت کی آماجگاہ بنا ڈالا۔۔گرمی اور حبس کی رات جب ہوا بھی سانس بند کیے کسی قید خانے میں سر پٹخ رہی تھی ایسی قیامت رات میں ہمیں مار مار کر سینکڑوں کی تعداد میں ایک نیم تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا اڑتالیس گھنٹے تک درد سے تڑپنے کے بعد جب ضمانت کرائی گئ تو ٹانگوں میں پڑنے والے زخموں میں ریشہ پڑ چکا تھا۔اس کی وجہ سے میں چلنے پھرنے سے بھی قاصر تھا۔پیشانی پر سوجن اتنی بڑھ گئ تھی کہ آنکھ بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔

آج ہاسپٹل کے ایک جنرل وارڈ پر ایک کونے میں لگے بستر پر بیٹھ کر میں نے اپنی اور اپنے باپ کی کہانی اپنے بچوں کے گوش گزار کی تھی۔۔۔وہ نظریں جھکائے ایک قطار میں کھڑے تھے۔۔۔آج ان کے آنسو خشک نہیں ہو پا رہے تھے۔میری بیٹی نے میرے پاس بیٹھ کر میرے ہاتھ تھام رکھے تھے۔۔۔آنسوؤں کا سیلِ رواں اس کی آنکھوں سے جاری تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلام آباد کے سیرینا ہوٹل میں قومی سطح پر "جناح کے وارث" کے عنوان پر سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔سامعین میں، میں میری بیوی اور میرے دونوں بیٹے شامل تھے۔۔۔۔سامنے سٹیج پر ڈائس کے پیچھے میری پیاری بیٹی مریم محمد علی کھڑی ہے۔اس کی آنکھیں نم ہیں اور وہ اپنے جذبات واحساسات کا آخری حصّہ بیان کر رہی ہے۔

"وطن کی محبت سینہ بہ سینہ، آنکھ در آنکھ، خواب بہ خواب یونہی منتقل ہوتی رہے گی، ہمیں تو وطن کی محبت کو روح کے ہر

گوشے میں سینچنا ہے۔ اسے اپنی ہر گزرتی سانس میں پروان چڑھانا ہے۔ اس کی محبت کا تعویز بنا کر گلے سے لگا کر رکھنا ہے۔ وہ محبت جو میرے دادا سے میرے والد کو منتقل ہوئی اور وہاں سے ہمارے سینوں کا اسے امیں بنایا گیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی محبت وہ قرض ہے جسے ہمارے قائد محمد علی جناح اور بزرگوں نے اپنی جان، مال گھر بار، عزت و آبرو قربان کر کے، ہمیں آزادی کی نعمت سے سرفراز کر کے، آزاد وطن میں سانس لینے کے قابل بنا کر ہمارے کاندھوں پر بار کی صورت رکھا ہے۔ جسے ہمیں اگلی نسلوں تک منتقل کرنا ہے۔ پاکستان کو اس کی اگلی نسلوں کے لیے رہنے کے قابل بنانا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک کو جناح کا وارث بننا ہے۔

اور یہ کہنا ہے

شکریہ پاکستان

مٹی کے تعویز بنا کے نام وطن کا گلے لگا کے

ہر مشکل سے ہاتھ چھڑا کے تیرے سارے خواب بچا کے

بس اتنا کہنے آئے ہیں۔

شکریہ پاکستان۔

محمد علی نے سر گھما کر دیکھا۔ پورے ہال میں لوگ اپنی جگہوں سے کھڑے ہو کر نم آنکھیں لیے تالیاں بجا رہے تھے۔

اور وہ سوچ رہا تھا کہ "کیا میں اپنی اگلی نسل تک خواب کا ورثہ منتقل کرنے میں کامیاب ہو گیا؟"

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس قسط پر آپکی قیمتی رائے کا انتظار رہے گا۔۔